# عصری اور دینی تعلیم گاہوں میں باہمی روابط

ڈاکٹر قاری محمد رضوان اللہ صاحب ازہری۔ صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری، قصۂ قدیم و جدید (اقبال)

ہمارا وطن دو صدی قبل سے انگریزی کی سیاسی [illegible] اور بڑھتے ہوئے اقتدار کے باعث مختلف تحریکات اور انقلابات کا گہوارہ [illegible] یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہو چکا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت کا طوفان سارے ملک پر چھا چکا تھا۔ بہادر شاہ ظفر رحمہ (وفات ۱۲۷۹ھ) کی اسیری، بوڑھے باپ کے سامنے جوان بیٹوں کا قتل، بیگمات کے ساتھ بہیمانہ سلوک، مجاہدین آزادی کو پھانسی اور کالے پانی کی سزائیں، انگریزوں کے ایسے مظالم تھے جن کی مزاحمت کے لئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت تھی جو بصیرت کے ساتھ یہ بھی محسوس کرے کہ کس طرح اس ملک میں دین کی حفاظت کے ساتھ اپنے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ [1]

۱۸۵۷ء میں اگرچہ علمائے کرام کی جد وجہد بظاہر ناکام ہو گئی لیکن اس کے اثرات باقی رہے۔ غدر کے بعد ذی شعور مسلمانوں نے اس مسئلہ کو دو طرح سے سوچا، ایک یہ کہ حکومت انگریزوں کی ہے اس لئے دینی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم اور انگریزی طرز زندگی کو بھی

---

۱۔ ابوالحسنات، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں۔ اعظم گڑھ ۱۹۳۶ء ص ۲۳۔

اپنایا جائے۔ دوسرا طرز فکر یہ تھا کہ برطانوی سامراج سے مقابلہ کرکے اسے ملک سے نکال باہر کیا جائے۔ ان احساسات کے ساتھ دو ایسی عبقری شخصیتوں کا ظہور ہوا جن کی مخلصانہ جدو جہد کے نتائج نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری اسلامی دنیا پر اثر انداز ہوئے۔ ان دونوں شخصیتوں کا مقصد ایک تھا۔ یعنی مسلمانوں کی فلاح و بہبود۔ اس لئے اختلاف نظر کے باوجود یہ دونوں شخصیتیں مختلف راہوں سے ایک ہی منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرتی رہیں۔ مولانا قاسم نانوتویؒ (وفات ۱۲۹۷ھ) ولی اللہی درس گاہ کے دینی حصہ کو دہلی سے دیو بند اور سر سید احمد خانؒ (وفات ۱۸۹۸ء) مدرسہ غازی الدین کے انگریزی حصہ کو علی گڑھ لے آئے۔

۱۸۲۵ء میں انگریزی حکومت نے مدرسہ غازی الدین (بیرون اجمیری دروازہ دہلی) کو علوم شرقیہ کا ایک مرکز قرار دیا تھا۔ اس کا نام مدرسۂ علوم شرقیہ تھا پھر مدرسہ دہلی ہوا پھر عربک کالج پھر دلی کالج ہوا اور اب ذاکر حسین کالج ہے۔ اس کے پہلے صدر مدرس مولوی رشید الدین خان دہلویؒ (وفات ۱۲۴۳ھ) تھے جو شاہ عبدالعزیزؒ (وفات ۱۲۳۹ھ) شاہ رفیع الدینؒ (وفات ۱۲۳۳ھ) اور شاہ عبدالقادرؒ (وفات ۱۲۳۰ھ) کے شاگرد رشید تھے۔ مولانا موصوف کی وفات کے بعد ان کے عزیز شاگرد مولانا مملوک العلیؒ (وفات ۱۲۶۷ھ) مدرسہ دہلی کے صدر مدرس ہوئے۔ سر سید احمد خانؒ (وفات ۱۸۹۸ء) مفتی ذکاء اللہؒ (وفات ۱۳۲۸ھ) مولوی ضیاء الدینؒ (وفات ۱۳۳۷ھ) ڈپٹی نذیر احمدؒ (وفات ۱۳۳۰ھ) اسی مدرسہ دہلی کے فیض یافتہ مشہور طالب علم ہیں! سر سید احمد خانؒ (وفات ۱۸۹۸ء) نے علی گڑھ میں انگریزی اسکول قائم کیا تو اس کا نام مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ رکھا۔ پھر وہ کالج بنا تو اینگلو محمڈن اورینٹل کالج ہوا اور اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔

۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں عام طور پر علم کے تین مراکز تھے (دہلی، لکھنؤ، خیرآباد) دہلی میں شاہ ولی اللہؒ (وفات ۱۷۶۲ء) کا خاندان کتاب و سنت کی تعلیم دے رہا تھا۔ لکھنؤ میں

علمائے فرنگی محل حدیث و اصول فقہ کی تدریس میں معروف تھے اور خیرآباد میں منطق و فلسفہ کی خدمات انجام دی جاتی تھیں۔ ۱؎

۱۸۵۷ء کے بعد دارالعلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ یکے بعد دیگرے وجود میں آئے۔ دارالعلوم دیوبند نے مسلمانوں کے دین کو سنبھالا اور مدرسۃ العلوم نے عصری اور معاشی علوم کے ذریعہ مسلمانوں کو دنیوی تباہی سے بچایا۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ اور دہلی کالج جو انگریزی درسگاہیں سمجھی جاتی تھیں ان کا دینیات کا شعبہ قریب قریب دارالعلوم دیوبند سے ہی متعلق رہا۔ مسلم یونیورسٹی شعبہ دینیات کے پہلے ناظم دیوبند کے فاضل مولانا عبداللہ انصاریؒ (وفات ۱۳۴۴ھ) تھے۔ ان کے بعد مولانا احمد میاں انصاریؒ دیوبندی وغیرہ کا تقرر کیا گیا۔ ۱۹۵۹ء میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی شعبہ دینیات کے پہلے صدر اور ڈین مقرر کئے گئے۔ ۲؎

دینی تعلیم کے لئے دلی سے جو اساتذۂ کرام دیوبند لائے گئے تھے ان میں اکثر ولی اللّٰہی درسگاہ کے فیض یافتہ تھے۔ حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ (وفات ۱۲۹۷ھ) مولانا یعقوب نانوتویؒ (وفات ۱۳۰۲ھ)، مولانا فضل الرحمانؒ (وفات ۱۳۲۵ھ)، مولانا ذوالفقار علیؒ (وفات ۱۳۲۲ھ) مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (وفات ۱۳۲۳ھ) کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ ۳؎

دیوبند اور علی گڑھ کے مابین ابتداء میں براہ راست اگرچہ کوئی تعلق نہ تھا لیکن تحریک خلافت کے ساتھ تحریک ترک موالات کا زور ہوا۔ اس تحریک کا ایک جز یہ بھی تھا کہ وہ اسکول اور کالج جو حکومت کے زیر اہتمام چل رہے ہیں۔ ان کا مقاطعہ کیا جائے۔ مولانا محمد علیؒ (وفات ۱۹۳۱ء)، مولانا شوکت علیؒ (وفات ۱۹۳۹ء) اس مقصد کے لئے پورے ملک کا دورہ کر رہے تھے۔ علی گڑھ کے جو طلبے

---

۱۔ رضوی، سید محبوب تاریخ دیوبند ۱۹۷۲ء ص ۳۳ ؛ بشیر الدین، واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲ شمسی پریس آگرہ ۱۹۱۹ء ص ۳-۷۶۲-۵ گیلانی، مناظر احسن، سوانح قاسمی، نظامی پریس ج ۲ ۱۳۷۴ھ ص ۴ ۔ ۲؎ رضوی، سید محبوب، حاشیہ تاریخ دیوبند ج ۲ ۱۹۷۲ء ص ۶۱-۱۵۹ ۳؎ رضوی، محبوب، تاریخ دیوبند ج ۱ جید برقی پریس دہلی ۱۹۷۷ء ص

نوجوانوں نے مولانا محمد علیؒ (وفات ۱۹۳۱ء) اور مولانا شوکت علیؒ (وفات ۱۹۳۹ء) کو دعوت دی کہ وہ علی گڑھ آکر بھی مقاطعہ کی دعوت دیں۔ جب یہ حضرات علی گڑھ آئے تو ذمہ داران علی گڑھ نے جلسہ کو ناکام بنانے کی کوشش کی۔ طلباء کو سخت ندامت ہوئی دوسرے دن طلباء نے پھر جلسہ کیا اور اس جلسہ میں محمد علیؒ (وفات ۱۹۳۱ء) شوکت علیؒ (وفات ۱۹۳۹ء) کی تقاریر نے ہوا کا رخ ہی بدل دیا [1]

مولانا محمد علیؒ (وفات ۱۹۳۱ء) اگرچہ علی گڑھ کالج کو آزاد بنانے میں کامیاب نہ ہوئے لیکن جو طلباء ان کی حمایت میں کالج سے علیحدہ ہوئے تھے ان کو ساتھ لے کر مولانا نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے الگ ایک درسگاہ قائم کی جس کی بنیاد تو علی گڑھ میں ڈالی گئی۔ لیکن بعد میں یہ دہلی منتقل ہوگئی۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جامعہ ملیہ علی گڑھ کے خلاف ردعمل تھا، حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی موجودہ صورت حال کا سرسیدؒ کے ان ارادوں اور منصوبوں سے مقابلہ کیا جائے جو شروع میں علی گڑھ سے متعلق تھے تو خیال ہوتا ہے کہ آج کا علی گڑھ سرسیدؒ کے ان سنہرے خواب کی ایک معمولی سی تعبیر ہے۔ سرکاری ملازمت کو علی گڑھ کا اہم ترین علمی مقصد بنانے کے سبب خود علی گڑھ کالج میں یہ احساس پیدا ہونے لگا تھا کہ علی گڑھ ہی تمام امراض کا علاج نہیں۔ قومی اصلاح وترقی کے لئے علی گڑھ کالج میں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کوئی عملی فرق نہیں ہے۔ اور یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جاسکتی کہ جامعہ کی تاسیس میں سب سے بڑا دخل مولانا محمد علی (وفات ۱۹۳۱ء) کا تھا جو علی گڑھ کے اولڈ بوائے بھی تھے ان اسباب کی بنا پر جامعہ ملیہ کو سرسید کی دلی خواہش کی تکمیل کہا جاسکتا ہے نہ کہ ان کی کوششوں کے خلاف ردعمل ہے چنانچہ ۲۹ راکتوبر ۱۹۲۰ء بروز جمعہ (۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ) کو شیخ الہند مولانا محمود الحسن (وفات ۱۹۲۰ء) سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افتتاحی جلسہ کی صدارت کی درخواست کی گئی شیخ الہند باوجود اپنی علالت کے مولانا محمد علی (وفات ۱۹۳۱ء) کے اصرار پر علی گڑھ تشریف لائے اور فرمایا۔

---

۱۔ مسعود عبدالغفار۔ جامعہ کی کہانی۔ مکتبہ جامعہ نگر دہلی۔ ۱۹۷۵ء ص ۲۰۔ ۱۹ شیخ محمد اکرام، موج کوثر۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۵ء ص ۱۳۵۔ ۵۳۔

اگر میری صدارت سے انگریزوں کو تکلیف ہوگی تو اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا۔[1]

اس خطبۂ صدارت کا خلاصہ جسے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (وفات ۱۳۶۹ھ) نے پڑھ کر سنایا تھا مندرجہ ذیل ہے۔

"حضرات! میں نے اس بڑھاپے اور علالت کی حالت میں جس کو آپ خود دیکھ رہے ہیں آپ کی دعوت کو اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نمازوں کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اٹھو اور امت مرحومہ کو انگریزوں کے نرغے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس طاری ہو جاتا ہے۔

اے نوجوان طلبا! میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غمخوار مدرسوں اور درس گاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا۔ اسی طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔ کچھ دنوں بعد بہت سے علماء میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں گے اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں گے لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر بظاہر میں علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے میرے اکابر نے کسی وقت بھی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا ہے۔ ہاں انگریزی تعلیم کے اثرات اور مذہبی لوگوں کا مذاق اڑانے سے ضرور ہوشیار کیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیم اغیار کے ہاتھوں کے کے بجائے مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو، تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر ہو۔[2]

اس موقع پر شیخ الہندؒ کے سامنے بعض طلبا نے اپنے شبہات پیش کئے جس کا

---

۱۔ حسین احمد مدنی، نقش حیات، ج ۲، دہلی ۱۹۵۴ء، ص ۲۵۰۔ ۲۔ حسین احمد مدنی، خطبۂ صدارت، مفتی المطابع دہلی ۱۹۲۰ء، ص ۳۲۔

آپ نے تسلی بخش جواب دیا جس سے طلبا مطمئن ہو گئے۔ شیخ الہندؒ کے اس مقدس سفر نے علی گڑھ دیوبند، جامعہ ملیہ کے آپسی رابطے کے باب ہمیشہ کے لئے کھول دیے۔ چنانچہ بیسویں صدی کی ابتدا میں جمعیۃ الانصار اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاںؒ (وفات ۱۹۳۰ء) کے ذریعہ قدیم وجدید تعلیم کو یکجا کرنے کی ایک کوشش یہ کی گئی تھی کہ علی گڑھ کے طلبار کو دیوبند بھیج کر عربی و دینی تعلیم کی طرف راغب و متوجہ کیا جائے۔ چند سال اس تجویز پر عمل بھی ہوا لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔[۱]

ہندوستان کی تمام عصری اور دینی تعلیم گاہیں مسلک اور مشرب کے اعتبار سے پانچ حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ اہل السنۃ والجماعۃ حنفی المسلک۔ جو بلا تخصیص دیوبندی، بریلوی کے لفظی اختلاف اور نظریات سے آزاد ہیں۔ ۲۔ اہل الحدیث ۳۔ شیعہ اثنا عشری (۴) اہل السنۃ والجماعۃ۔ احناف بریلوی (۵) اہل السنۃ والجماعت۔

احناف دیوبندی۔ ان مختلف الخیال مشارب کے باوجود یہ سمجھنا غلط ہے کہ اختلاف مسلک اور مشرب کی وجہ سے ان عصری اور دینی درسگاہوں کے مابین ربط و اتحاد کی کمی تھی۔ اختلافِ مسلک کے باوجود نصاب کا تقریباً ایک طرح کا ہونا۔ اساتذہ و طلباء میں مختلف الخیال ہونے کے باوجود کسی قسم کا نزاع نہ ہونا، نظام تعلیم، امتحانات، تعطیلات، نشست و برخاست کے آداب ہر مکتب فکر کے یکساں ہونا باہمی ارتباط اور مشترک اقدار کی بین دلیل ہیں۔ چنانچہ مادر وطن کی یہ عصری اور دینی درسگاہیں مسلک و مشرب کے اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے قریب نظر آتی ہیں۔

---

۱۔ محمد میاں۔ علمائے حق۔ کتب خانہ فخریہ مراد آباد ۱۹۴۶ء ص ضیاء الحسن فاروقی: د.

DARULULOOM DEOBAND AND DEMAND FOR PAKISTAN بمبئی ۱۹۶۳ ص ۷۹

علوم جدیدہ عربی فارسی علما وفضلاء کی دین تھے لیکن علماء کی ایک جماعت جدید فلسفہ سے شروع شروع دور ہی اور بعد کے علماء میں ایسے افراد پیدا ہوئے جنہیں ان علوم کی ضرورت کا احساس ہوا اور انھوں نے سوچا کہ دینی درسگاہوں کا نصاب حالات وزمانہ کی رعایت اور ضروریات کے مطابق رکھا جائے۔ قدیم وجدید علماء کے درمیان ایک تعلیمی اور مذہبی ربط ہوا۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء میں جب ندوہ قائم ہوا تو اس خیال کو جن لوگوں نے عملی جامہ پہنایا ان میں مولوی سید محمد علی مونگیریؒ (وفات ۱۳۴۶ھ) مولانا شبلیؒ (وفات ۱۹۱۴ء) مولوی عبدالحق خیرآبادیؒ (وفات ۱۳۱۸ھ) سرسیدؒ (وفات ۱۸۹۸ء) نواب محسن الملکؒ (وفات ۱۳۲۵ھ) اور نواب وقار الملک (وفات ۱۹۱۷ء) کے اسمار سرفہرست نظر آتے ہیں۔[1]

سرسیدؒ نے تو ندوۃ العلماء کے ناظم مولوی محمد علیؒ (وفات ۱۳۴۶ھ) کے نام ایک خط میں اپنے خیالات کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا ہے:

"ایک عمدہ کام شروع ہوا۔ اس کو چلنے دینا چاہیئے۔ خدا اس کا نیک نتیجہ پیدا کرے۔ اگرچہ مجھ کو کچھ توقع نہیں ہے کہ باہم علماء کا اتفاق ہو الا کوشش ضرور ہو۔"[2]

۱۳۱۱ھ میں کانپور میں ندوہ کے قیام کے سلسلے میں جو ابتدائی مشورے اور جلسے ہوئے ان میں بالتفریق مسلک ندوۃ العلماء نے اپنی نصابی کمیٹی میں جہاں مولانا محمد علی مونگیریؒ (وفات ۱۳۴۶ھ)، مولانا محمود حسنؒ (وفات ۱۹۲۰ء)، مولانا اشرف علی تھانوی (وفات ۱۳۶۲ھ) مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ (وفات ۱۳۴۶ھ)، مولانا شبلی نعمانیؒ (وفات ۱۹۱۴ء) مفتی لطف اللہ علی گڑھی (وفات ۱۳۳۱ھ) کو رکن بنایا وہاں بریلی کے مشہور عالم مولانا احمد رضا خانؒ (وفات ۱۳۴۰ھ) کو بھی اس کمیٹی کا ممبر نامزد کیا۔[3]

---

[1] محمد اکرام۔ موج کوثر لاہور ۱۹۷۵ء ص ۱۸۷ [2] معارف ج ۴ جولائی ۱۹۱۹ء ص ۳ [3] قدرۃ اللہ عبدالسلام۔ ندوۃ العلماء کے پچاسی سال، لکھنؤ ۱۹۷۶ء ص ۵۔

دراصل ندوہ کو دو چشموں سے فیض ملا ہے۔ ایک علی گڑھ سے مولانا شبلیؒ (وفات ۱۹۱۴ء) کے ذریعہ جنہوں نے مغربی درس و تدریس اور جدید علوم کے اصولوں کو ندوہ تک پہنچایا اور دوسرے مصر سے جو یورپ سے قریب ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی دنیا کا مرکز ہے ندوہ نے دیگر درسگاہوں کے مقابلہ میں مصر کی جدید معلومات اور زبان و ادب سے زیادہ فیض حاصل کیا۔[1]

سرسیدؒ کے عقائد سے اکثر دینی درسگاہیں بدظن تھیں لیکن یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سرسید نے دہلی کے علوم اسلامیہ کے مرکز، خاندان ولی اللٰہی کے فیض یافتوں اور خوشہ چینوں سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا۔ اس بنا پر دین اسلام اور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں جو والہانہ محبت تھی اس کا اعتراف نہ کرنا بھی بے انصافی ہوگا چنانچہ نواب محسن الملکؒ (وفات ۱۳۲۵ھ) کو لندن سے ایک خط میں یوں مخاطب ہیں:۔

"ان دنوں میرے دل کو ذرا سوزش ہے۔ ولیم میور نے جو کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں لکھی ہے اس نے دل کو جلا دیا ہے۔ اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ سیرت پر کتاب لکھوں۔ اگر اس کام کے لئے تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت کے دن ممکن ہے یہ کہہ کر پکارا جاؤں کہاں ہے وہ بڈھا فقیر؟ جس نے سیرت پاک پر کتاب لکھی۔"

سرسیدؒ (وفات ۱۸۹۸ء) جس تعلیم گاہ کا خواب دیکھ رہے تھے اس کے متعلق انھوں نے خود کہا تھا۔ "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر" لیکن جس صحیح مذہبی اور دینی تربیت کو وہ

---

[1] محمد اکرام۔ موج کوثر۔ لاہور۔ ۱۹۷۵ء ص ۹۶۔ ۱۹۱

ضروری سمجھتے تھے اس کی کامیابی اپنی زندگی میں نہ دیکھ سکے[1]

مولانا شبلیؒ (وفات ۱۹۱۴ء) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ علی گڑھ تحریک کے خلاف جو ردِ عمل ہوا اس میں شبلیؒ کا بڑا ہاتھ تھا۔ لیکن دنیا یہ بھی تسلیم کرتی ہے کہ مولانا شبلیؒ خود اس تحریک کے ممتاز اور سرگرم رکن ہونے کے باوجود سولہ سال تک سرسیدؒ کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرتے رہے[2]

ان عصری اور دینی درسگاہوں کے مختصر جائزہ کے بعد بڑی ناانصافی ہوگی اگر روابط کے اعتبار سے خصوصی طور پر دارالعلوم دیوبند کا ذکر نہ کیا جائے جس کے روابط بلا تفریق مسلک ومشرب نہ صرف تمام عصری اور دینی درس گاہوں سے قائم رہے بلکہ اس کے اثرات تمام ممالک اسلامیہ تک پہنچے۔ سو سے زاید درس گاہیں جن میں مظاہر علوم سہارنپور، مدرسہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر، اسلامی مدرسہ میرٹھ، خورجہ، بلند شہر، دان پور، مراد آباد، مدرسہ امینیہ دہلی، مدرسہ عالیہ کلکتہ، مدرسہ ڈابھیل اور منظر الاسلام بریلی وغیرہ وغیرہ ایک ہی نہج پر چل رہے ہیں۔ مشرق ومغرب کی قدیم وجدید کشمکش کے باوجود ان دینی اور عصری درس گاہوں پر شاہ ولی اللہ دہلویؒ (وفات ۱۷۶۲) کا بڑا احسان ہے جنہوں نے قدیم وجدید کی کشمکش سے ہٹ کر عقلی اور وقتی مصالح کے تقاضوں کا پورا خیال رکھا۔

ہندوستان میں اسلام کو تین خطرے درپیش تھے۔ پہلا خطرہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے تھا۔ دوسرا خطرہ یورپ اور ہندوستان میں ان خیالات کا اظہار تھا جنہیں دیکھ کر بقول سرسیدؒ مرجانے کو جی چاہتا تھا۔ جیسے ولیم میور (وفات ۱۹۰۵ء) کی کتاب لائف آف محمد صفحہ ۵۳۵ مطبوعہ لندن ۱۸۷۷ء کا نعوذ باللہ یہ انگریزی جملہ "انسانیت کے دو سب سے بڑے دشمن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار اور قرآن ہیں[3]"۔

---

[1] محمد اکرام مصدر سابق ص ۱۴۶ [2] محمد اکرام موج کوثر لاہور ۱۹۷۵ء ص ۲۹۷ [3] میور ولیم LIFE OF MUHAMMAD لندن ۱۸۷۷ء ص ۵۳۵۔

تیسرا بڑا خطرہ یہ تھا کہ مسلمان اسلام کے بعض مسائل کو خلافِ عقل سمجھ کر عیسائیت کی طرف مائل ہونے لگے تھے۔ ان تینوں خطرات کا ازالہ مولانا قاسم نانوتویؒ (وفات ۱۲۹۷ھ) مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ (وفات ۱۲۸۱ھ) مولانا آل حسن موہانیؒ (وفات ۱۲۸۷ھ) مفتی کفایت اللہ وفات ۱۹۵۲ء، مولانا حسین احمد مدنیؒ (وفات ۱۳۷۷ھ) مولانا ثناء اللہؒ (وفات ۱۹۴۸ء) مولانا الیاس دہلویؒ (وفات ۱۹۴۴ء) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (وفات ۱۹۷۹ء) مولانا قاری محمد طیبؒ (پیدائش ۱۸۹۷ء) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (پیدائش ۱۳۳۳ھ) مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، پیدائش ۱۳۱۹ھ) مولانا منت اللہ رحمانی، پیدائش ۱۳۳۲ھ) قاضی زین العابدین پیدائش ۱۹۱۰ء مولانا سعید احمد اکبرآبادی (پیدائش ۱۹۰۷ء) اور دیگر علمائے کرام نے اس طرح کیا کہ ان کے مقابلہ میں کتابیں لکھیں، مناظرے کئے اور پمفلٹ تقسیم کئے۔ یہ انھیں بزرگوں کی سعی کا نتیجہ تھا کہ عیسائی مبلغین اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکے اور دینی درسگاہیں باہمی روابط کے ساتھ آج ایک صدی سے جو کام انجام دے رہی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی "فضلائے دارالعلوم کا جمہور عوام سے جو ربط ہے وہ کسی دیگر دینی جماعت کا نہیں۔ سارے ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کا جال بچھا ہوا ہے" [1]

ہندوستان کے ان مدارس اسلامیہ کا یہ علمی فیض نہ صرف ہندوستان تک محدود ہے بلکہ اس کے فضلاء کے فیوض و روابط پورے عالم اسلام تک پہنچے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ (وفات ۱۳۷۷ھ) مولانا بدر عالم میرٹھیؒ (وفات ۱۹۶۵ء) شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب نے پیدائش ۱۳۱۵ھ حرم نبوی میں درس حدیث کی خدمات انجام دی ہیں۔

---

[1] ندوی۔ سید ابوالحسن علی تعلیم جدید کا چیلنج لکھنؤ ۱۹۷۷ء ص ۲۹۔ رضوی۔ سید محبوب۔ تاریخ دیوبند ج ۱ دہلی ۱۹۷۷ء۔ ص ۱۴۱۔

اسی طرح عرب ممالک سے محمد المامون الارزنجانی، شیخ عبد التواب، شیخ عبد المنعم نمر شیخ محمد عبد الوہاب، شیخ جمال مناع اور دیگر عرب ہندوستان آکر عربی زبان کی تعلیم دیتے رہے۔ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک سے آئے ہوئے طلباء کی ایک بڑی تعداد ان دینی درسگاہوں میں ہر وقت موجود رہتی ہے جو نہ صرف رابطہ کا ایک بڑا ذریعہ ہیں بلکہ دینی اداروں کی مستقل شہرت کا باعث ہیں۔[۱]

۱۳۳۰ھ میں جب سید رشید رضا مصری (وفات ۱۹۳۵ء) ندوۃ العلماء کی دعوت پر ہندوستان آئے تو لکھنؤ سے دیوبند پہنچے۔ ان کی پوری تقریر کا متن اس مختصر مقالہ میں پیش کرنا ممکن نہیں۔ لیکن چند جملے پیش خدمت ہیں:۔

| | |
|---|---|
| علی انی رایت فی مدرسۃ دیوبند التی تلقب بازھر الھند نھضۃ دینیۃ علمیۃ جدیدۃ نرجوان یکون لھا نفع عظیم۔ | اس کے علاوہ یہ ہے کہ میں نے مدرسۂ دیوبند میں جس کو ازہر الہند کا خطاب دیا جاتا ہے ایک جدید علمی تحریک دیکھی جس سے نفع عظیم کی توقع ہوتی ہے۔ |

مدرسہ دیوبند کے منتظمین نے کبھی اس کو ازہر الہند کے نام سے مشہور کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ کبھی اس خطاب کو اس کے نام کے ساتھ استعمال کیا۔ مگر یہ اس کی مقبولیت وعظمت کی دلیل ہے کہ خود بخود اس کو ایک ایسے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے۔

چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| ما قرت عینی بشئی فی الھند کما قرت بر ؤیۃ مدرسۃ دیوبند ولا سرت بشئی ھناک کسرورھا بما لام | ہندوستان بھر میں میری آنکھ کو ایسی ٹھنڈک کہیں حاصل نہیں ہوئی جیسی کہ مدرسہ دیوبند میں حاصل ہوئی تھی اور نہ اتنی خوشی کہیں |

---

۱۔ رضوی۔ سید محبوب۔ تاریخ دیوبند ج ۱، ۱۹۷۷ء ص ۳۰۸۔

لہا من الغیرۃ والاخلاص فی علماء هذه المدرسة ۔
وکان کثیر من اخوانی المسلمین فی بلاد الهند المختلفة یذکرون لی هذه المدرسة ویصفون رجال الدنیا منهم علماء وهابا لجمود والتعصب ویظهرون رغبتهم فی اصلاح تعمیم نفعها وقد رأیتهم ولله الحمد فوق جمیع ما سمعت عنهم من ثناء وانتقاد ۔ ا

حاصل ہوتی بنتی وہاں۔ اور یہ صرف اس غیرت و اخلاص کی وجہ سے تھی جو میں نے اس مدرسے کے علماء میں دیکھی میرے سامنے مختلف شہروں میں بہت سے مسلمان بھائیوں نے اس مدرسہ کا بھلائی کے ساتھ ذکر کیا۔ اور بہت سے دنیا دار لوگوں نے علماء مدرسہ کی نسبت جامد ومتعصب ہونے کا خیال بیان کرکے اپنی رغبت اس کی اصلاح اور تعمیم نفع کی طرف ظاہر کی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے ان کو (علماء دیوبند کو) مدح کرنے والوں کی مدح سے ' ان کی نکتہ چینیوں کی نکتہ چینی سے بہت اونچا پایا۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعلیمی تحریک سے ابتداء میں جو غلط فہمیاں عصری اور دینی درسگاہوں میں پیدا ہوگئی تھیں اب ان میں کسی حد تک تخفیف ہوتی جارہی ہے۔ آج محسوس کیا جارہا ہے کہ کوئی قوم اپنی قومی روایات اور ملی مزاج کو کھوکر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے قدیم وجدید کی کشمکش اور اس کے خطرات سے بالاتر ہوکر ہم کو اس کا علاج تجویز کرنا ہے اور اس کے بلند حوصلوں اور مضبوط ارادوں کے ساتھ سعی پیہم اور ان تھک کوششوں کی ضرورت ہے۔

روشن ہے افق پردہ مقدر کا ستارا — مشرق سے ابھرنے کو ہے سورج کا کنارا
اٹھ رفعتِ گردوں سے فرشتے نے پکارا — ہاں چیر دے اے عزم جواں سینۂ خارا
در کا نگہہ دہر جواں باش جواں خیز — اے عزم جواں، عزم جواں، عزم جواں خیز!

---

۱۔ محمد رشید رضا المنار مقالہ دکتور دار العلوم۔ دیوبند واثرہا الاسلامی فی الہند۔ جامعۃ الازہر مصر ۱۹۸۱ء ص ۳۴
حبیب الرحمان۔ القاسم دیوبند نومبر ۱۹۱۲ء ص ۳-۲